سوال وجواب

مجلہ ثقافت

جناب ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب ایم اے ڈی لٹ پرنسپل اورینٹل کالج، لاہور (و یونیورسٹی پروفیسر صدر شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی) نے ماہنامۂ "ثقافت" پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مفصل مراسلہ ارسال فرمایا ہے۔ ہم قارئین کی دلچسپی کے لئے اس اہم تبصرے کو درج کرتے ہیں:

یونیورسٹی اورینٹل کالج

۱۸/ فروری ۵۵ء

مخدومی ڈاکٹر خلیفہ صاحب۔ سلام مسنون۔

ماہنامہ "ثقافت" کا پہلا پرچہ نظر سے گزرا۔ دلی مبارکباد قبول کیجئے۔ مگر میرا دل چاہتا ہے کہ اپنے احساسات کو صرف رسمی تبریک و تحسین تک محدود نہ رکھوں۔ بلکہ اس تبریک کے کچھ وجوہ بھی بیان کروں۔ تاکہ ادارہ ثقافت کو یہ اطمینان ہو کہ ان کی اس گراں قدر کوشش کے متعلق قارئین کا نقطۂ نظر اور احساس کیا ہے۔ اور درحقیقت یہ اظہار اس معاہدہ ذہنی یا معہود ذہنی کی تکمیل ہے جو کہ ایک مجلہ اور اس کے قارئین کے مابین ایک سبیل مفاہمت پیدا کرتی ہے۔

ماہنامۂ ثقافت کی اس اشاعت اولین میں جو چیز مجھے سب سے زیادہ پسند آئی ہے۔ وہ اس کے اغراض و مقاصد کی بحث ہے۔ جو محض افتتاحیہ کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ اداریہ کی عام رسمی اور عرضی حدود سے بہت آگے نکل کر ایک علمی مقالہ یا فاضلانہ مضمون کی حد میں داخل ہو گئی ہے۔ اس میں آپ نے اپنے اساسی مقاصد پر جس جامع شگفتہ اور دلچسپ انداز میں بحث کی ہے۔ لائق تعریف ہے۔ بلکہ یوں کہوں کہ محتاج تعریف نہیں۔ آپ نے بڑے اچھے انداز میں قارئین کو بتایا ہے، کہ ثقافت میں کیا نہیں ہو گا۔ اور پھر یہ بھی بتایا ہے کہ ثقافت میں کیا ہو گا۔ ان دونوں حدبندیوں سے آپ نے اپنے اس پرچے کے اغراض و مقاصد کو خوب واضح کر دیا ہے۔ جس کے پڑھنے سے وہ سب تصورات ایک "آئینہ تمثال دار" کی طرح متشکل ہو کر ذہن و خیال کے سامنے آ گئے ہیں جو آپ کے پیش نظر ہیں۔ اور کچھ کچھ نقشہ قائم ہو جاتا ہے۔ ان فکری تعمیرات کا جن سے آپ کی یہ نئی دنیا معمور و آباد ہو گی۔ دعا ہے کہ آپ کی یہ مساعی وہ پھل پھول لائیں۔ جن کے طراوت بخش رنگ اور روح افزا خوشبو سے ہمارا یہ دور اور آنے والے سب ادوار لذت گیر اور راحت اندوز ہوں۔ آپ کی تصریحات کو بغور پڑھنے سے چند اصولی سوالات میرے ذہن میں پیدا ہوئے ہیں۔ جن کے معاملے میں میں آپ کو اپنا شریک راز بنانا ضروری خیال کرتا ہوں۔ ثقافت کے سلسلے میں ایک بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ آخر ثقافت سے ہماری مراد کیا ہے؟ کیا یہ کسی منظم مسلک

عمل کا نام ہے یا محض من کی موج یا مجرد فکر یا کوئی اندازِ حیات ہے ۔ یا ان سب کا مجموعہ ہے ۔ اس کا تعلق فرد کے اعمال و عادات سے ہے ۔ یا یہ اس اجتماعی یک رنگی اور سماجی تنظیم کا نام ہے جس کو وحدتِ قومی بھی کہا جا سکتا ہے ۔ پھر یہ بھی کہ اس کے نفوذ کے سرچشمے داخلی ہیں یا خارجی یا ایسے کہ باطن میں پوشیدہ رہ کر خارجی کوائف زندگی پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں ۔ میں نے ثقافت کے متعلق آپ کے خیالات ہمایوں میں بھی پڑھے تھے ۔ مگر ان سے بھی قطعی طور پر یہ واضح نہ ہو سکا کہ ثقافت جن لطیف مظاہر یا مشاعر سے متعلق ہے ۔ ان کی مخصوص شکل کیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ کلچر ، تمدن ، تہذیب ، سولزیشن یہ الفاظ جزوی ترادف کے باوجود مرادف نہیں ۔ پھر کیا ہماری موجودہ اصطلاح "ثقافت" بھی کوئی اسی طرح کی ناقابلِ تعریف چیز ہے ۔ یا اس کی کوئی جامع مانع تعریف کی جا سکتی ہے ۔ میں نے آپ کی گراں قدر تصنیف "اعتقادیاتِ اسلامی" یا "معتقداتِ اسلامی" بھی پڑھی ہے ۔ اس میں بھی بعض بعض موقعوں پر یہ بحث آئی ہے ۔ مگر موضوع کے فرق نے وہاں بھی بات کو صاف نہیں ہونے دیا ۔ ان حالات میں اگر آپ آئندہ شمارے میں اس عجیب و غریب لفظ کے متعلق مزید تفصیل سے کام لیں تو بہت فائدہ ہو گا ۔ اسی طرح کا ایک اہم سوال یہ ہے کہ ثقافتِ اسلامیہ کیا چیز ہے ۔ کیا یہ دینِ اسلام کا دوسرا نام ہے یا دین سے کم کوئی مظاہرۂ ذہن یا مسلکِ عمل ہے ۔ یا اس سے زیادہ کوئی مجموعۂ آثار و خصائل ہے ۔ اس طرح یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے ۔ کہ اگر دین اور ثقافت کم و بیش مرادف الفاظ ہیں تو دین کی متعارف اور پسندیدہ تر اصطلاح کو ترک کرنے میں کونسی خاص مصلحت ہے ۔ اور اگر دونوں میں کوئی تغائر یا تناقص ہے ۔ تو دین سے تعارض کے اس میں کون کون سے پہلو ہیں ۔

آپ کو یاد ہو گا ۔ ایک مرتبہ پنڈت جواہر لال نہرو نے "اسلامک کلچر" اور "ہندو کلچر" کے نعروں کا مضحکہ اڑاتے ہوئے یہ کہا تھا کہ یہ وہ الفاظ ہیں جو کبھی شرمندہ معنی نہیں ہوئے اس وقت جناب پنڈت کے اس چیلنج کا کئی لوگوں نے جواب دیا تھا ۔ اور یہ ثابت کیا تھا کہ ہندو کلچر کوئی حقیقت ہو یا نہ ہو اسلامک کلچر بہر حال ایک زندہ حقیقت ہے ۔ مگر افسوس ہے کہ اس وقت یہ بحث اس وجہ سے تشنہ سی رہی کہ اس میں سیاست دخیل تھی معترض نے اعتراض ہی سیاسی وجوہ سے کیا تھا ۔ اس لئے اس کا سیاسی اور الزامی جواب اس کو مل گیا مگر اب جبکہ اس بحث میں کوئی پنڈت یا کوئی برہمن دخیل نہیں یہ بحث پھر اٹھائی جا سکتی ہے ۔ اور یہ پوچھا جا سکتا ہے ۔ کہ ہم جس اسلامک کلچر کے مدعی یا مبلغ ہیں ۔ آخر اس کی حقیقت اور نوعیت کیا ہے ۔ کیا یہ صرف عقیدہ اور زاویۂ نظر ہے یا کوئی عمل بھی ۔ اور اگر یہ کوئی عمل ہے تو زمانی اور مکانی تسلسل نے اس کو حیاتِ اجتماعی کی کن کن روایات سے مربوط کر رکھا ہے اور اگر یہ روایات آج بھی زندہ ہیں ۔ یا زندہ رہنے کے قابل ہیں تو ان کا حضور سرورِ کائنات اور قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی زندگی سے بھی کچھ ربط ہے یا نہیں ۔ غرض اس قسم کے گوناگوں سوالات و شکوک خیل در خیل اور قطار اندر قطار سامنے آ جاتے ہیں ۔ جن کا تشفی بخش جواب اذعان و ایقان کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے بے حد ضروری ہے ۔ محض یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ جو لوگ زمانے کے ساتھ نہیں بدلتے زمانہ ان کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے ۔ اگر ثقافت اسلام کسی ازلی صداقت کا نام ہے ۔ تو اس کو زمانے کے تغیرات کے تابع نہیں سمجھا جا سکتا ۔

آپ کی عالمانہ تصریحات کے ضمن میں بعض دلچسپ اور بحث انگیز فقرات بھی آگئے ہیں۔ مثلاً آپ نے فرمایا ہے کہ اس رسالے کا اصل مقصد۔ ذہن کی ان بنیادی قدروں کو واضح کرنا ہے جن پر سارا عالم متحد ہو سکے۔ بے شک مجھے اس مقصد سے پورا پورا اتفاق ہے، کہ دین کی ان بنیادی قدروں کو واضح کیا جائے۔ جن پر سارا عالم متحد ہو سکے۔ مگر سوال یہ ہے۔ کہ ”بنیادی قدریں یا یہ عالمگیر صداقتیں تو روزِ ازل سے واضح اور ظاہر ہیں ان پر سارا عالم آج تک کیوں نہ متحد ہوا“۔ ایک وجہ تو یہی ہے (جیسا کہ آپ نے خود ہی فرمایا) کہ ان قدروں کو زندگی کے ”اصلی مسائل“ سے منقطع کر کے دیکھا جاتا رہا اور اگر سچ پوچھا جائے تو یہی زندگی کے مسائل عالمگیر اتحاد کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ پس اگر یہ سچ ہے۔ تو زندگی کے یہ اصلی مسائل کسی عقلی تجزیہ اور کسی معقول منصوبہ بندی کے بغیر کیسے حل ہوں گے محض عالمگیر صداقتوں کی تشریح یا چند مجرد حقیقتوں کے اعلان سے تو زندگی کے ٹھوس مسائل نہ کبھی حل ہوئے ہیں نہ ہوں گے سارے عالم کے اتحاد کی عمارت کا بنیادی پتھر یہ ہے کہ دُنیا میں زندہ رہنے کے وسائل سب کے لئے یکساں طور پر مہیا ہوں تاکہ انسانوں کے دلوں میں وہ صفائی اور اعتماد پیدا ہو۔ جس کے نہ ہونے سے خدا کی مخلوق طبقوں اور گروہوں میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو رہی ہے میرا خیال یہ ہے کہ نیا زمانہ اور اس کے نئے تقاضے اس بات کا صاف مطالبہ کرتے ہیں۔ کہ اصلاح و تہذیب کی مہم مادہ سے شروع ہو کر تکمیل روحانی کی طرف بڑھتی جائے، نہ کہ بالعکس، مادہ اگرچہ سراپا زندگی ہے مگر زندگی کی راہ میں سنگِ گراں بھی ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اس کی ہمواری کا سامان ہونا چاہیئے۔ حجۃ الاسلام امام غزالیؒ نے منقذ میں ایک مقام پر لکھا ہے ”تعجب ہے کہ لوگ دشواریوں کے آسان علاج چھوڑ کر مشکل تدبیروں میں لگے رہتے ہیں گھر کے چراغ سے آگ حاصل کرنے کی بجائے چقماق کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ تاکہ اس سے آگ سلگائیں“ مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے۔ کہ ہمارا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ ہم جدید زندگی کی تشکیل میں ایسی تدابیر اختیار کرنا چاہتے ہیں جو بیحد ناقابل گرفت اور دشوار ہیں۔ مجھے تسلیم ہے کہ ”دینِ صحیح“ کی رہنمائی سے یہ سب کام آسان ہو سکتے ہیں۔ مگر سب سے بڑا سوال تو یہی ہے کہ ”دینِ صحیح“ کی تعریف بھی تو نہیں کی جا سکتی۔ اور جب حالت یہ ہے۔ تو پھر کیوں وہ تدبیر اختیار نہ کی جائے جو قابل فہم بھی ہو۔ اور آسان بھی یعنی مادی مسائل کا محض عقلی حل“ اس میں دین کو لانے کی کیا ضرورت ہے۔

آپ نے ایک فقرے میں تسکین رُوح کا سوال بھی چھیڑا ہے۔ مگر یہ سوال بڑا پریشان کن ہے۔ چند دن پہلے میاں بشیر احمد صاحب نے بھی یہی سوال چھیڑا تھا کہ دراصل یہ کتاب زندگی کا وہ مستقل سوالیہ نشان ہے۔ جس کی تفسیریں لاتعداد ہیں۔ اور عجب یہ ہے۔ کہ جس قدر اس کے جواب زیادہ دیئے گئے ہیں اسی قدر اس کا جواب زیادہ مبہم ہوتا گیا ہے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ قرآن حکیم نے ”الا بذکر اللہ تطمئن القلوب“ کے ارشاد پاک سے ہماری ڈھارس بندھائی ہے۔ مگر ارشادِ نبویؐ کا یہ اعتراف دیکھ کر کہ ”حزن و غم میرا شریک حال رہتا ہے“ (الحزن رفیقی) مجھے اس بدقسمت مخلوق یعنی انسان کی حالت پر رحم آتا ہے۔ اور یہ خیال ہوتا ہے۔ کہ شاید مولانا بحر العلوم کے بقول غم دائم اور فراقِ دائم ہی حیات انسانی کا ایک لازمہ مستقل ہے۔ غرض سکونِ روحانی کی بحث (جو آپ کے دائرۂ مقاصد سے خارج نہیں) نہایت اہم اور بنیادی ہے۔ ثقافت

کے مضمون نگار اس کے تجزیہ کی خاص کوشش کریں تو پڑھنے والوں کو بڑا فائدہ ہوگا۔

میری گزارشات کا خلاصہ صرف یہ ہے۔ کہ آپ آئندہ پرچوں میں جہاں تک ممکن ہو مندرجہ ذیل مباحث پر ضرور روشنی ڈالیں تاکہ وہ اشکال دُور ہوں جو بعض مبہم اصطلاحوں نے خواہ مخواہ پیدا کر رکھے ہیں۔ مثلاً:

اوّل: دین کیا ہے۔

دوم: ثقافت کلچر۔ تہذیب کیا ہے۔

سوم: ثقافتِ اسلامیہ کیا ہے اور اس کے وہ خاص نقوش کیا ہیں۔ جو اسکو دوسری ثقافتوں سے ممتاز کرتے ہیں۔

چہارم: زندگی کی تکمیل کی مہم کا رخ مادہ سے روح کی جانب ہو یا بالعکس۔

پنجم: کیا روحانی سکون ممکن ہے اگر ممکن ہے تو اس کے حصول کا کیا ذریعہ ہے۔

ثقافت کے اس شمارے میں جتنے مضامین شائع ہوئے ہیں سب کے سب نتیجہ خیز اور مفید ہیں۔ مگر امام غزالی کی سرگزشت انقلاب ایک ایسی روح پرور کہانی ہے جس کو اور بھی پھیلا کر بیان کیا جاتا تو اچھا ہوتا۔! درحقیقت انسان کی اصلاح کے لئے انسان کی سرگزشت سے زیادہ مؤثر کوئی چیز نہیں۔ میری تجویز یہ ہے کہ اگر آپ مناسب خیال کریں تو آئندہ پرچوں میں دُوسرے اعاظم رجال کی سرگزشت ہائے انقلاب بھی یکے بعد دیگرے پیش ہوتی رہیں۔ تاکہ دلوں کے عقدے حل ہوں اور باطن کی وہ ظلمتیں دُور ہوں۔ جن سے فضائے قلب نور سے محروم رہتی ہے۔ میں آخر میں یہ عرض کروں گا کہ آپ نے جن اعلیٰ مقاصد کے پیشِ نظر یہ پرچہ نکالا ہے۔ ان کی تکمیل موجودہ وقت کا سب سے بڑا تقاضا ہے۔ بحمداللہ کہ ثقافت کا یہ اوّلین نمبر ان توقعات کو باحسن وجوہ پورا کر رہا ہے۔ جو اس مجلہ سے (آپ کے انتساب کے سبب) بجا طور پر وابستہ ہیں۔ ہرچند کہ یہ "اعلیٰ مقاصد ایسی جنس ہیں جنکی بازار میں مانگ نہیں"۔ مگر مجھے پورا اطمینان ہے کہ یہ رسالہ تھوڑے ہی عرصے میں اس جنس کی عام مانگ پیدا کر دیگا۔ کیونکہ جنس کی خوبی ہی مانگ کی کثرت کا ذریعہ ہُوا کرتی ہے۔ ہمارے ملک میں یوں بھی اچھے رسالوں کی قلت ہے۔ اور اس موضوع پر تو شاید کوئی رسالہ موجود ہی نہیں۔ مجھے کامل توقع ہے کہ "ثقافت" ہماری حیاتِ فکری میں اسی طرح ایک تحریک اور تموج کا منبع ثابت ہوگا۔ جس طرح تقریباً ایک صدی قبل سرسیّد کا تہذیب الاخلاق ثابت ہُوا تھا۔ والسّلام

نیازمند
سیّد عبداللہ

ثقافت: فاضل مراسلہ نگار کے خط سے بہ آسانی یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے "ثقافت" کا پہلا شمارہ جس غور و فکر اور دلچسپی کے ساتھ پڑھا ہے اسی عمق اور شگفتگی کے ساتھ مخلصانہ اور آزادانہ تبصرہ بھی فرمایا ہے۔ بہت کم لوگ ہونگے جنھوں نے ماہنامۂ ثقافت کے مقاصد اور اس کی اہمیت کو اس انداز سے محسوس کیا ہو اور اس کی کامیابی کے متعلق اتنے پُرامید ہوں۔ ممدوح نے جو مشورے دیئے ہیں وُہ بھی بہت قابلِ قدر ہیں۔

جناب ڈاکٹر صاحب نے جن مباحث پر خصوصیت کے ساتھ روشنی ڈالنے کی فرمائش کی ہے وہ یہ ہیں :

(۱) دین کیا ہے ؟

(۲) ثقافت، کلچر، تہذیب کیا ہے ؟

(۳) ثقافت اسلامیہ کیا ہے اور اس کے وہ خاص نقوش کیا ہیں جو اسے دوسری ثقافتوں سے ممتاز کرتے ہیں ؟

(۴) زندگی کی تکمیل کی مہم کا رخ مادّے سے روح کی جانب ہو یا بالعکس ؟

(۵) کیا روحانی سکون ممکن ہے ؟ اگر ممکن ہے تو اس کے حصول کا کیا ذریعہ ہے ؟

اوّل الذکر دو سوالات دوسرے مراسلہ نگار بھی کر چکے ہیں اور "ثقافت" کے دوسرے اور تیسرے شمارے میں ان کا جواب آ چکا ہے اور اسی سے تیسرے سوال کا جواب بھی خود بخود نکل آتا ہے جو تیسرے شمارے میں موجود ہے کہ اسلام ایک ایسا دین ہے جو ہر ثقافت میں کھپ سکتا ہے۔ ہر کلچر کے صرف اس حصے کو جس کا رخ خیر کی طرف نہ ہو بدل دیتا ہے۔ اور جس کا رخ خیر کی طرف ہو اسے اپنا لیتا ہے۔

کسی ملک یا قوم کا کوئی مخصوص کلچر ہی اسلامی کلچر نہیں بلکہ اسلامی اصول و مقاصد کے مطابق ہر اچھا کلچر اس کا اپنا کلچر ہے۔ مصر کا کلچر اور ہے، پاکستان کا اور، عرب کا اور افریقہ کا اور۔ لیکن اس کے باوجود یہ سب اسلامی کلچر ہو سکتے ہیں۔ اگر مصر کا لباس چغہ ہو اور ترکی کا ہو کوٹ تو یہ دونوں ہی اسلامی کلچر کا جزو ہو سکتے ہیں اور دین یہ دونوں لباس استعمال کرنے والے باشندوں میں کھپ سکتا ہے۔ اسلامی کلچر عمومی طور پر اس کلچر کو کہتے ہیں جو مسلمانوں کے ممالک میں عموماً رائج و مقبول ہو اور اس کا رخ شر کی طرف نہ ہو۔ بعض چیزیں تو ایسی ہیں جو مسلمانوں کے بیشتر ممالک میں مشترک ہیں۔ اور بعض جدا گانہ ہیں۔ جواہر لال نہرو نے ہندوستانی مسلمانوں کا کلچر ٹوٹی دار لوٹا اور ہندوؤں کا بے ٹوٹی کی لٹیا قرار دیا لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ اگر یہ سارے ہندو اسلام لے آئیں اور لٹیا ہی کا استعمال جاری رکھیں تو یہ لٹیا بھی مسلم کلچر میں شامل ہو جائے گی۔ یہاں بنیادی اہمیت استعمال کرنے والوں کو حاصل ہے نہ کہ استعمالی اشیاء کو۔ اسلامی کلچر کے خاص نقوش اور امتیازی خصوصیت یہی ہے کہ اس کا رخ خیر کی طرف ہو۔ ورنہ اگر تمام روئے زمین کے مسلمانوں میں بھی کوئی ایسا کلچر رائج ہو جائے جس کا رخ خیر کی طرف نہ ہو تو وہ کلچر اسلامی نہیں بلکہ غیر اسلامی ہی ہوگا۔

فاضل مراسلہ نگار کا چوتھا سوال بہت اہم ہے اور وہ یہ ہے کہ :

زندگی کی تکمیل کی مہم کا رخ مادّے سے روح کی طرف ہونا چاہئیے یا بالعکس ؟

جہاں تک ہم سمجھ سکے ہیں اسلام روح اور مادّے کی ثنویت کا قائل ہی نہیں۔ انسان نہ صرف روح ہے نہ فقط مادّہ۔ وہ آن واحد میں ان دونوں کا مجموعہ ہے لہٰذا اسلام ان دونوں کو ایک وحدت تصور کر کے اپنی ہر ہدایت میں دونوں کو ایک ساتھ ملحوظ رکھتا ہے۔ ہاں کبھی کبھی تقدیم و تاخیر ہو جاتی ہے لیکن یہ تقدیم و تاخر مصلحت و ضرورت کی وجہ سے ہوتی ہے بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو نہ اسے وعظ کہا جاتا ہے نہ اخلاقی تعلیم دی جاتی ہے نہ نماز روزے کا پابند بنایا جاتا ہے۔ اس کی صرف مادّی پرورش ہوتی ہے اور اسے زندہ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے کیونکہ اس کے سوا اس میں دوسری اہلیتیں نہیں ہوتیں لیکن صرف مادّی ضروریات

کی تکمیل ہی ساری عمر نہیں ہوتی۔ اہلیت کی رفتار کے ساتھ ساتھ روحانی و اخلاقی تربیت بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح حالتِ اضطرار پیدا ہونے سے پہلے تک، حرام غذاؤں کا استعمال حرام ہے حالانکہ مادی ضرورت اس سے بھی پوری ہوسکتی ہے۔ یہ تقدم و تاخر وقتی ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے دو شہسوار ساتھ ساتھ چل رہے ہوں لیکن کوئی تنگنائے عبور کرنے کے لئے آگے پیچھے بھی ہوجاتے ہوں۔ پس وہ ادارے بھی غلط ہیں جو زندگی کی تکمیل کے لئے مطلقاً مادے کو مقدم رکھتے ہوں اور وہ نظریئے بھی غیر صحیح ہیں جو بالاطلاق روح سے مادے کی طرف لے جاتے ہوں۔

پانچواں سوال سب سے زیادہ اہم ہے کہ:

کیا روحانی سکون ممکن ہے؟ اگر ممکن ہے تو اس کے حصول کا کیا ذریعہ ہے؟

یہ سوال جتنا زیادہ اہم ہے اسی قدر اس کا جواب مشکل ہے۔ مختصراً ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ سکون تو دراصل موت ہے خواہ روح کا سکون ہو یا دل کی دھڑکن کا۔ ہماری مراد روحانی سکون یا تسکین سے وہ سکون نہیں جو موت کا مرادف ہے۔ اس سے ہمارا مقصد روحانی "اطمینان" ہے اور اطمینان ایک حالت کا نام ہے جو خوشی و غم، صلح و جنگ، فقر و غنا، شکست و فتح، صحت و مرض۔ غرض ہر حال میں قائم رہتی ہے۔ وہ جس راہ پر لگا ہوتا ہے اس پر اسے یہ اطمینان ہوتا ہے کہ یہ صحیح ہے یہ نفس مطمئنہ اس سے کبھی جدا نہیں ہوتا۔ کوئی ساعت ایسی نہ تھی کہ حضور صلعم کو اصلاحِ عالم کا غم کھائے نہ جارہا ہو۔ اس لئے الحزن رفیقی بالکل صحیح ارشاد ہے لیکن اس کے باوجود روح کا اطمینان ایک لمحے کے لئے بھی کبھی منفک نہیں ہوا۔ اس کی مثال یوں ہوسکتی ہے کہ ایک دولتمند آدمی اس وقت تک دولتمند ہے جب تک دولت اس کے قبضہ و تصرف میں ہے۔ اس کے ہاں کوئی شادی ہورہی ہو یا اس کے گھر سے جنازہ نکل رہا ہو، وہ تندرست ہو، یا حالتِ نزع میں ہو، مصروف گفتگو ہو یا خاموش ہو، کسی سے معانقہ کررہا ہو، یا بر سر پیکار ہو، کھانا کھا رہا ہو یا بھوکا ہو۔ ہر حال میں وہ دولت مند ہے۔ لہٰذا الا بذکر اللہ تطمئن القلوب اور الحزن رفیقی میں کوئی تناقص نہیں۔ بلکہ غم و حزن تو ایک ایسی نعمت ہے کہ اس کے بغیر ارتقا ممکن ہی نہیں بقول غالب ؎

زیزداں غم آمد دل افروز من　　　چراغ شب و اخترِ روز من

ہاں یہ ضرور ہے کہ حزن اگر انسان میں یاس و بے عملی کا کوئی شائبہ پیدا کرے تو وہ محمود نہیں ہوتا۔ اس وقت کے لئے یہ فرمانِ ہدایت ہے کہ لاتحزن ان اللہ معنا اور الا ان اولیاء اللہ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون۔

یہی حال خوف کا بھی ہے۔ اگر اس سے مقابلے کی جرأت اور تیاری کی سرگرمی پیدا ہو تو یہ خوف بھی محمود ہوتا ہے اور اگر اس سے یہ صلاحیتیں سلب ہوجائیں تو یہی خوف غیر محمود بن جاتا ہے۔ پس الحزن رفیقی کو اس کسوٹی پر پرکھ کر دیکھنا چاہیئے کہ یہ پیچھے لے جارہا ہے یا آگے بڑھا رہا ہے۔ اگر یہ صاحب فرمانؐ کو آگے بڑھاتا ہے ـــ اور یقیناً حقیقت یوں ہی ہے ـــ تو روحانی اطمینان سے اس کا کوئی تباین و تناقض نہیں۔ دولت نعمتِ الٰہی بھی ہے اور لعنتِ خداوندی بھی۔ فرق صرف

استعمال یا زاویۂ نگاہ کا ہے۔ یہی حال تمام اقدار کا ہے۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ روحانی سیر و سلوک کی عجیب عجیب منزلیں ہوتی ہیں۔ یہاں اضطراب بھی عین اطمینان ہوتا ہے اور سکون بے سکونی ہوتی ہے۔ حافظ نے خوب کہا ہے کہ ؎

مصلحت نیست مرا سیری ازآں آبِ حیات　　　ضاعف اللہ بہ کل زمان عطشی

یہاں سیرابی نام ہی ہے پیاس بڑھتے رہنے کا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح زندگی نام ہے شہید ہو جانے کا۔

ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات ط بل احیاء ولٰکن ۵ تشعرون ۵

روحانی اطمینان کسی مقام پر جا کر ختم نہیں ہو جاتا۔ ہر اگلا قدم جو مزید اطمینان کی طلب میں آگے بڑھتا ہے پچھلے قدم کو عدم اطمینان کا مقام دے دیتا ہے اور یہ تسلسل جاری رہتا ہے۔ اگر کسی مقام پر یہ ارتقاء رک جائے تو وہ یا تنزل ہوتا ہے یا موت۔

رہا یہ کہ یہ روحانی تسکین حاصل ہونے کا کیا ذریعہ ہے؟ تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اس کا ذریعہ صرف ذکر اور فکر ہے۔ ابتدا میں یہ دو چیزیں معلوم ہوتی ہیں لیکن آگے چل کر دونوں ایک وحدت میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ بقولِ اقبالؒ ؎

چیست قرآں "اختلاطِ ذکر و فکر"　　　فکر را کامل نہ دیدم جز بہ ذکر

اس موضوع کی تمام تشریحات اس وقت پیشِ نظر نہیں۔ اس موضوع پر اور ان تمام موضوعات پر جن کی طرف آپ نے توجہ دلائی ہے "ثقافت" میں وقتاً فوقتاً مقالے آتے رہیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مراسلہ نگار نے اپنے خط میں ایک دلچسپ اور اہم سوال اور بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

"بنیادی قدریں یا یہ عالمگیر صداقتیں تو روزِ ازل سے واضح اور ظاہر ہیں ان پر سارا عالم آج تک کیوں نہ متحد ہوا؟"

"ثقافت" نے اس کی جو وجہ بتائی ہے اس کی تائید کرتے ہوئے فاضل مراسلہ نگار نے معاشی ہمواری کو اس کا علاج بتایا ہے۔ یعنی "اصلاح و تہذیب کی مہم مادے سے شروع ہو کر تکمیل روحانی کی طرف بڑھتی جائے نہ کہ بالعکس"۔

ہم روح اور مادے کی حیثیت کے متعلق اوپر عرض کر چکے ہیں اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اصل سوال کا جواب ہم مختصراً یوں عرض کریں گے کہ یہی تو انسان کی کمزوری ہے کہ وہ صداقتوں کو جانتا اور پہچانتا ہوا بھی اپنی عملی زندگی میں ان سے کتراتا ہے کس انسان کو یہ معلوم نہیں کہ سچائی، مساوات، ہمدردی، عدل اعلیٰ اقدار اور قیمتی صفات ہیں لیکن کوئی غلط نگہی یا خود غرضی آڑے آ جاتی ہے جو وہ صحیح سمجھنے کے باوجود بعض اوقات ان کو اختیار کرنے میں تامل کرتا ہے اور طرح طرح کی تاویلات و توجیہات سے اپنے دل کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے مصلحین (خواہ انبیا ہوں یا غیر انبیا) کا یہی کام ہوتا ہے جانی پہچانی اقدار (معروفات) میں دل زبان اور عمل کو ہم آہنگ کرا دیں جب تک انسان اس منزلِ مقصود پر نہیں پہنچتا آپ کا سوال قائم و باقی رہے گا۔ رہا اس کا مادی علاج (معاشی ہمواری) تو یہ بھی دراصل انہی بنیادی اقدار اور عالمگیر صداقتوں ہی کا ایک عملی حصہ ہے جن کو اجاگر کرنا ہمارا ایک اہم مقصد ہے۔